تہی دامن نہیں ہیں ہم

قطعات

یوسف خالد

تہی دامن نہیں ہیں ہم

(قطعات)

یوسف خالد

سلسلہ اشاعت: 141

تاریخ اشاعت: مارچ 2024

قیمت: =/800 روپے

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں۔

اشاعت / حقوق: یوسف خالد

10۔ مدینہ ٹاؤن، سرگودھا

نام کتاب: تہی دامن نہیں ہیں ہم

کمپوزنگ: ''ماہوزا'' کمپیوٹر کمپوزنگ، فیصل آباد

تزئین: علی حسن زیدی

سرِورق: ارحم گرافکس

بائنڈنگ: محمد اشرف 0324-7720541

مطبع: زیدیؔ، ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد 0300-6619124

اہتمام: اہلِ قلم کا اشاعتی ادارہ، فیصل آباد

.........................o.........................

ڈاکٹر منور ہاشمی کے نام

لکھی ہے ہم نے باوضو ہو کر حدیثِ دل
پڑھیے حضور اس کو بڑے احترام سے
اتری ہے شب کے پچھلے پہر اوس کی طرح
پلکوں پہ جم گئی ہے بڑے اہتمام سے

لطافت اور رومان کے کنول

ادب اور تنقید کے بیسیوں نظریات اور دسیوں زاویے بھی ہو جائیں تو شعر کا بنیادی ڈھانچہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی وجودیاتی (Ontological) اور علمیاتی (Epistemological) تصورات پر ہی قائم ہوگا۔اول الذکر میں وزن، بحر، قافیہ، ردیف، بامعنی الفاظ اور ان کا باہمی ربط وضبط شامل ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کے بغیر شعر کا وجود ہی قائم نہیں ہوتا جبکہ ثانی الذکر میں وہ سب عناصر شامل ہیں جن سے شعر میں حسن اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔اس میں بیان و بدیع، مضمون و معنی آفرینی کے علاوہ رعایتوں، مناسبتوں اور کیفیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شامل ہے جن کو ہر شاعر اپنی جودتِ طبع اور ذوقِ جمال کے مطابق بروئے کار لاتا ہے اور انہی سے شاعر کا رنگ اور اسلوب قائم ہوتا ہے۔ یہی اسلوب شاعر کو منفرد و ممتاز کرتا ہے اور اسی انفراد و امتیاز سے شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ پھر وہ غزل کہے، نظم یا کسی اور صنف میں طبع آزمائی کرے، اس کا اپنا رنگ ایک ایک مصرعے سے عیاں ہوتا ہے۔ پروفیسر یوسف خالد بھی انہی منفرد شاعروں میں سے ہے جس نے اردو نظم اور غزل میں اپنی پہچان قائم کرنے کے بعد قطعہ نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کو ثابت کیا۔ میر و غالب اور اقبال و ظفر اقبال اگر ہزاروں کے دلوں میں دھڑکتے ہیں تو اس لیے کہ چاروں صاحبِ اسلوب ہیں اور میرے نزدیک وہی شاعر حقیقت میں شاعر کہلانے کا حق دار ہے جس کا شعری اسلوب اس کے ہونے کی گواہی دے اور یوسف خالد ان خوش قسمت شعرا میں سے ایک ہیں جو اپنے اسلوب کی وجہ سے رومان پرور شاعر کہلانے

کے مستحق ہیں۔

اردو قطعہ نگاری کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنف عرب سے نکل کر فارس پہنچی، پھلی پھولی اور وہاں سے اردو میں شامل ہوئی۔شروع میں شاعر اپنی غزل میں دو شعروں کو قطعہ بند کرتے ہوئے اسے غزل سے الگ نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کے پاس چار مصرعوں میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے کے لیے رباعی جیسی نازک صنف موجود تھی۔ کلاسیکی دور میں سیاسی اور سماجی تنقید کے لیے قطعات لکھے گئے۔جعفر زٹلی کا نام اس حوالے سے نمایاں ہے۔میر وسودا نے قطعات بطور تہنیت اور تاریخ کے لکھے۔ پھر یہ سلسلہ ذوق و غالب سے حالی و شبلی تک پہنچا اور وہاں سے اختر انصاری نے اسے رباعی کی طرح چار مصرعوں میں لکھ کر فروغ دیا۔اگر چہ ہر زمانے کے شعرا نے قطعہ نگاری کو اپنایا لیکن انہوں نے قطعات کے الگ سے مجموعے شائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سلسلہ جدید قطعہ نگاری تک پہنچا اور انجمنِ پنجاب نے اسے فروغ دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس سے اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، اقبال، چکبست، شاد، فانی اور جگر جیسے شعرا کے ذریعے قطعہ نگاری کو راہ ملی اور قطعہ نگاری ایک باقاعدہ صنفِ سخن بن گئی۔ اقبال، اختر انصاری اور احسان دانش اپنے اسلوب اور فکری رویوں کی وجہ سے قطعہ نگاری کے معماروں میں سے ہیں۔مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر اقبال، احسان دانش اور اختر انصاری کا ایک ایک قطعہ دیکھیے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

(اقبال)

تیری نگاہِ لطف کے حق دار ہیں وہ لوگ
یک لمحہ درد و غم سے فراغت نہیں جنہیں
تو سر بہ سر کرم ہے ان احباب کے لیے
مطلق ترے کرم کی ضرورت نہیں جنہیں

(احسان دانش)

دل کو برباد کیے جاتی ہے
غم بدستور دیے جاتی ہے
مر چکیں ساری امیدیں اختر
آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے

(اختر انصاری)

بیسویں صدی میں ہی اخبارات کے لیے باقاعدہ قطعات لکھنے کا رواج ہوا۔ اخبارات نے شاعروں کو ملازمتیں اور معاوضے پیش کیے تاکہ تازہ ترین سیاسی صورتِ حال پر چار مصرعے کہیں جو تحریر و تقریر میں بھی کام آئیں۔ یوسف خالد کی کتاب کا مسودہ پہنچنے تک میرا بھی یہی خیال تھا کہ شاید اخباری ضروریات اور سیاسی مسائل پر تنقید کے لیے لکھے گئے قطعات کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں مگر جب قطعات کا مطالعہ شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ ان کے قطعات میں غزل کے سارے لوازمات پوری کیفیت اور کیمیت سے جلوہ گر ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ ان چار مصرعوں کی نظموں کا خمیر غزل کے اجمال و اختصار اور لطافت و ایمائیت سے اٹھا ہے۔ ان قطعات کا مرکز و محور وہ رومان ہے جو وحشی کو انسان بناتا ہے اور پتھر کو موم کرتا ہے۔ یہی شبنمی احساس، سیلِ حیرت اور مشاہداتی عمق ان قطعات کا تخلیقی جواز ہے۔ وہ زمانے کو محبت کی آنکھ سے دیکھتے اور رومان کے چشمے سے دریافت کرنے کے تمنائی دکھائی دیتے ہیں۔

اس سے پہلے یوسف خالد کے قطعات کے دو مجموعے اہلِ فن سے داد وصول کر چکے ہیں۔ دونوں مجموعوں کے قطعات میں جو خواب ناک فضا اور رومان پرور شعری ماحول تشکیل دیا ہے، موجودہ مجموعہ ایک خفیف مشاہداتی اور شعوری ارتقا کے ساتھ فنی حوالے سے پہلے دو مجموعات کا تسلسل ہے۔ یوسف خالد اور دیگر قطعہ نگاروں کا بنیادی فرق قطعات کی جمع و تدوین اور پورے مجموعے کی صورت میں پیش کرنے کا ہی نہیں ہے، شعری آہنگ، جمالیاتی اقدار، انسانی رویوں کے مشاہدات، متنوع کیفیات اور اسلوب کا بھی ہے۔"خوابوں کے حاشیے پر" ڈاکٹر منور ہاشمی نے یوسف خالد کو جدید ترین رومانی قطعہ نگاری کا بانی اور مخترع قرار دیا ہے تو بلا مبالغہ قرائن و شواہد اس بات کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔ یوسف خالد نے قطعات کو جس سنجیدگی سے لیا ہے اور اس سے قبل دو مجموعے شائع کروائے اس سے ایک چیز اور بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یوسف خالد اردو ادب میں سب سے زیادہ قطعات کہنے والے شاعر ہیں۔ یہ تعداد مقداری ہی نہیں معیاری بھی ہے۔

اگر چہ قطعہ میں رباعی کی طرح اوزان اور مصرعوں کی تعداد کی قید نہیں لیکن فی زمانہ چار مصرعوں پر مشتمل قطعات ہی رواج پا چکے ہیں اور یوسف خالد نے اسی مروج روایت کی پیروی کی ہے۔ جہاں تک ان کے (Poetic Locale) کا تعلق ہے انھوں نے کسی خاص علاقے یا مقام سے خود کو جوڑ کر شعر نہیں کہے۔ ان کی شعری اپج زمان و مکاں کے وہ منطقے دریافت کرتی ہے جن میں خوشبو، رنگ اور روشنی کی تکثیر ہو اور اس تکثیری خزانے سے نئے جہانوں کی تعمیر ممکن ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کی طبیعت میں تحرک زیادہ اور تجرد کم سے کم ہو۔ اس کی آنکھ ان دیکھے کو دیکھ سکتی ہو اور ان کہی کو لفظوں کا لباس پہنا سکتی ہو۔ مثال کے طور پر

یہ قطعات دیکھیے :

چاندنی شب اور ساحل کی ہوا
ایسے عالم میں تمھارا ساتھ ہو
دیکھتی ہوں سرپھری لہریں ہمیں
میرے ہاتھوں میں تمھارا ہاتھ ہو

اس کے لبوں پہ کھلتی ہوئی مسکراہٹیں
کتنی حیات بخش ہیں اس کو خبر نہیں
آنکھوں سے اس کی ہیں عیاں سب دل کی حالتیں
مجھ کو یقیں ہے اس کا سفر بے ثمر نہیں

اس کے لبوں پہ گیت تھے آنکھوں میں پیاس تھی
انجان راستوں پہ وہ تنہا نکل گئی
اوڑھا ہوا تھا اس نے نئی رت کا بانکپن
لیکن اسے مزاج کی تلخی نگل گئی

اس کے بغیر زندگی دشوار تھی بہت
اس سے ملے تو اور بھی دشوار ہو گئی
یہ کیسی آرزو ہے کہ ملنے کے بعد پھر
مل کر بچھڑنے کے لیے تیار ہوگئی

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف خالد جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے کیوں کہ ایک آسودہ زندگی ہر باشعور اور باذوق انسان کا خواب ہے مگر یہ خواب روز بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں اور یوسف خالد معاشرے کی آنکھوں میں بنتے ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں چن کر شعری پیرائے میں پرونے پر مامور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خواب دیکھنا انسان کی فطرت ہی نہیں مجبوری بھی ہے اور اس عمل میں جب تک تسلسل قائم رہتا ہے انسان شکست خوردہ نہیں ہوتا۔ خواب دیکھنے کا یہ عمل محبت سے فروغ پاتا ہے اور جب محبت کم ظرفی کا شکار ہوتی ہے تو خواب ہی نہیں، انسان بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوسف خالد کے یہاں انسان کی نمو اور نمود کا انحصار محبت کی کلی پھوٹنے پر ہے۔ وہ محبت کو انسانی حیات کا سب سے خوب صورت احساس سمجھتے ہیں اور زندگی کو محبت کے بغیر ویران و بنجر خیال کرتے ہیں اور انسان کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ایسے غارت نہ کر محبت کو
یہ کلی ہر جگہ نہیں کھِلتی
اس کے ملنے پہ شادیانے بجا
کم نصیبوں کو یہ نہیں ملتی

بوقتِ صبح یہ احساس کرتا ہے مجھے بے خود
یقیں کی اوڑھنی اوڑھے کوئی سرشار رہتا ہے
خوشی کے سب حوالے معتبر ہیں اس حوالے سے
کہ کوئی ہے جو مجھ میں صورتِ مہکار رہتا ہے

پہلی بار کھلا ہے ہم پہ گدلی رت کتنی گدلی تھی
کتنے پردے چاک ہوئے ہیں تاریکی چھٹ جانے سے
دھند میں لپٹے ہر شاطر کی اپنی ایک کہانی ہے
کتنے ہیرے پتھر ہو گئے چلمن کے ہٹ جانے سے

دنیا کے تمام شاعروں کے یہاں اپنے اردو گرد کے ماحول سے عدم مطابقت اور نا آسودگی پائی جاتی ہے۔ یہی نا آسودگی اور ایک حد تک بے چینی ان کا شعری رویہ متعین کرتی ہے۔اس عمل میں مشاہدہ اور مطالعہ سب سے بڑا معاون ہوتا ہے۔فلسفیوں نے اس عدم اطمینان کی کیفیت میں جو شاعری کی اس میں زندگی کے بارے میں کوئی خاص نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی جس کی تائید میں اقبال کی شاعری ایک مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ترقی پسندوں نے اس نا آسودگی کے ردِعمل میں جو شاعری کی وہ جمالیاتی قدروں سے زیادہ شعر کے ابلاغ کو اہمیت دیتی ہے اس لیے ان کے یہاں زندگی کو دیکھنے کا زاویہ جمالیاتی سے زیادہ حقیقی معلوم ہوتا اور ترقی پسندوں کی شاعری فوری اثر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی کے دو قطعات دیکھیے:

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی ہے
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اٹھتا ہے

دوسرے قطعے میں محبت کا ناسٹیلجیا جس طرح ردِعمل دکھاتا ہے اس سے شعریت اور لطافت کا ایک خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے۔اس کے مقابلے میں پہلے قطعے کے ساتھ آج کے اخباری قطعات کو ملا کر دیکھیے تو ابلاغ کے علاوہ کوئی ایسی قدر دکھائی نہیں دیتی جس سے شعریت کشید کی جا سکے۔وہ لوگ جو زندگی کے کسی بڑے فلسفے کو بیان کرنے کی بجائے زندگی کی مختلف کیفیتوں حقیقتوں اور جہتوں کو بیان کرتے ہیں اور کسی ایک مقام پر بھی شعریت کو Compromise نہیں کرتے،شاعری کی دیوی بھی ہمیشہ انہی پر مہربان ہوتی ہے۔یوسف خالد انہی شعرامیں سے ایک ہیں۔وہ فکر وفن کی یکجائی کے قائل بھی ہیں اور عامل بھی اور ان کے قطعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں:

خود کو دیکھا ہے خود سے باہر بھی
بوجھ پہچان کا نہیں اترا
کتنی مشکل ہے خود شناسی بھی
قرض اس جان کا نہیں اترا

اسے یہ زعم تھا وہ سب سے بہتر ہے سو بالآخر
وہ خوش فہمی میں اپنے روز و شب ویران کر بیٹھا
وہ جذبوں کی عدالت میں دلیلیں لے کے آیا تھا
وہ خود سر اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کر بیٹھا

اسی موضوع کو مزید پھیلایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابلاغ شعر کی ضرورت ہے مگر جمال شعر کا حسن ہے۔ابلاغ عام ذہن کو قائل کرتا ہے جبکہ جمال خاص ذہن کو قائل کرتا ہے۔ابلاغ سے شعر کی ترسیل ہوتی ہے جبکہ جمال سے شعر کی ترتیل ہوتی

ہےاوراس عمل کووہی سمجھ سکتا ہے جونزول اورانزال کےفرق سے واقف ہے۔ یوسف خالد نے جمال کوابلاغ پرمقدم رکھا اس لیے معاشرتی المیوں پر بھی ان کے قطعات استعاراتی رنگوں میں رنگے دکھائی دیتے ہیں۔

جھوٹ بولا گیا مہارت سے
سچ کے ماتھے پہ اب پسینہ ہے
جو بھی کالا تھا ہو رہا ہے سفید
کس فسوں گر کا یہ دفینہ ہے

درد کی توقیر کچھ قائم رہے
چشمِ تر میں آنسووں کو روک لے
بے نوائی میں کوئی مفہوم رکھ
گفتگو کے سلسلوں کو روک لے

یوسف خالد کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کے قطعات کے موضوعات وہی ہیں جوغزل کے مروج موضوعات ہیں مگران کا اندازِ پیش کش تغزل سے رچا ہوا ہے۔انہوں نے زندگی کومحبت کی عینک سے دیکھا ہےاورمحبت کوہی زندگی کا حقیقی چہرہ سمجھتے ہیں۔ان کا موضوعاتی مطالعہ کیا جائے تو محبت پہلا عنوان بنے گا۔ مزیدغورکیا جائے توزندگی کی خوش رنگیاں اور بد رنگیاں ان کی شاعری کا مرکزی موضوع بن کر سامنے آتی ہیں۔سماج کے دوہرے معیارات پر تنقید اور ان کو سدھارنے کے لیےمحبت اور بار بارمحبت ہی ان کے یہاں بطورِلازمہ حیات کارفرما ہے۔ وہ انسان کوانسان کے آئینے سے دیکھتے ہوئے بھی محبت کو ہرزاویے میں مقدم رکھتے ہیں۔جس طرح رس گلے اورگلاب جامن کا بنیادی جوہرشیرہ ہوتا ہےاسی طرح یوسف خالدکی شاعری کا بنیادی جوہرمحبت اور بےلوث محبت ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ محاکاتی ادات کو بروئے کار بلکہ بروئے شعر لانے کے پرچارک ہیں اور شعر کو لطافت کا پیکر بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں۔ان کی نظموں کی طرح ان کے قطعات بھی حسن و جمال اور لطافت و محبت کے پیامی ہیں۔رومان پرور ماحول، جدتِ احساس، مشاہداتی عمق اور مصرع سازی ان کے کلام کا وہ وصف ہے جس نے یوسف خالد کے قطعات کو جمالیات کا پیکر بنا دیا ہے۔ان کا شعر بسر کیا ہوا ہونے کی وجہ سے شعوری سطح پر دماغ اور کیفیاتی سطح پر دل کو بھی ہاتھ ڈالتا ہے۔ان کا شعری ماحول میر تقی میر کی طرح زمین اور اس سے جڑے عناصر سے تشکیل پاتا ہے اس لیے پہلی قرات میں ہی اپنا اپنا محسوس ہونے لگتا ہے۔زبان و بیان کے حوالے سے انہوں نے جس لطافت اور نفاست کا اظہار کیا ہے اس سے ان کا شعری آہنگ نرم و ملائم ہو گیا ہے اور شعروں میں روانی پیدا ہو گئی ہے۔فکری سطح پر ان کا شعر کہیں کہیں سماجی شکست و ریخت کا ردِ عمل بھی بنتا ہے مگر مجموعی طور پر ان کا رومانی اسلوب غالب رہتا ہے۔ان قطعات کی قرآت سے کئی نئے تنقیدی زاویوں کی طرف بھی دھیان جاتا ہے مگر اس بات کو مستقبل قریب پر اٹھا رکھتے ہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ صحافتی ضرورتوں اور نعریہ اخباری قطعات کے بے رنگ اور بے کیف ماحول میں محبت اور لطافت سے گندھے ہوئے رومان انگیز اور شیریں قلم قطعات کی اشاعت پر یوسف خالد مبارک باد کے حق دار ہیں۔

علی صابر رضوی

اوکاڑہ

تہی دامن نہیں ہیں ہم

(قطعات)



ادھوری نظم کے شکوے بجا اپنی جگہ لیکن
ادھورے رابطے لفظوں کو بے ترتیب کرتے ہیں
جو آنکھوں میں اُتر کر جانبِ دل گامزن نا ہوں
وہ کم آمیز ہر احساس کی تکذیب کرتے ہیں



اس کے بغیر زندگی دشوار تھی بہت
اس سے ملے تو اور بھی دشوار ہو گئی
یہ کیسی آرزو ہے کہ ملنے کے بعد پھر
مل کر بچھڑنے کے لیے تیار ہو گئی



اس کے لبوں پہ کھلتی ہوئی مسکراہٹیں
کتنی حیات بخش ہیں اس کو خبر نہیں
آنکھوں سے اس کی ہیں عیاں سب دل کی حالتیں
مجھ کو یقیں ہے اس کا سفر بے ثمر نہیں



اس کے لبوں پہ گیت تھے آنکھوں میں پیاس تھی
انجان راستوں پہ وہ تنہا نکل گئی
اوڑھا ہوا تھا اس نے نئی رت کا بانکپن
لیکن اسے مزاج کی تلخی نگل گئی



اس نے رکھا مضطرب احساس کے ماتھے پہ ہاتھ
ایک میٹھی سی حرارت جسم و جاں میں گھل گئی
عارض و لب کی عطائے خاص سے ممکن ہوا
منکشف مجھ پر نہیں تھی جو حقیقت کھل گئی



اسے یہ زعم تھا وہ سب سے بہتر ہے سو بالآخر
وہ خوش فہمی میں اپنے روز و شب ویران کر بیٹھا
وہ جذبوں کی عدالت میں دلیلیں لے کے آیا تھا
وہ خود سر اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کر بیٹھا



آنکھ میں نقش کیسے ہو پاتا
دھند چھائی ہوئی تھی منظر پر
ہم کسی طور پڑھ نہیں پائے
کیا خبر کیا لکھا تھا پتھر پر



ایک احساس میں محبوس ہیں سانسیں میری
اک فسوں کار کی بخشی ہوئی حیرانی ہے
دل کسی طور رہائی کا طلب گار نہیں
قید ایسی ہے کہ راحت کی فراوانی ہے



بد گمانی کی وبا میں سب کے سب ہیں مبتلا
کوئی اچھا ہو بھی تو اچھا نہیں لگتا ہمیں
کیا کبھی ہو پائے گا اس بے یقینی کا علاج
اس حوالے سے کوئی تو مطمئن کرتا ہمیں



بہت بے کار ہیں یہ بہتے آنسو
کسی سے گفتگو کرتے نہیں ہیں
پسِ پردہ ہے جو مخفی حقیقت
اسے کیوں روبرو کرتے نہیں ہیں



بوقتِ صبح یہ احساس کرتا ہے مجھے بے خود
یقیں کی اوڑھنی اوڑھے کوئی سرشار رہتا ہے
خوشی کے سب حوالے معتبر ہیں اس حوالے سے
کہ کوئی ہے جو مجھ میں صورتِ مہکار رہتا ہے



پسِ پردہ کہانی اور ہے کچھ
ہمیں کچھ اور دکھلایا گیا ہے
ہمارے خواب ہم سے چھن گئے ہیں
ہمیں اس طور بہکایا گیا ہے



پہلی بار کھلا ہے ہم   پہ گدلی رت کتنی گدلی تھی
کتنے پردے چاک ہوئے ہیں تاریکی چھٹ جانے سے
دھند میں لپٹے ہر شاطر کی اپنی ایک کہانی تھی
کتنے ہیرے پتھر ہو گئے چلمن کے ہٹ جانے سے



تم غور کرو گے تو مجھے جان سکو گے
بن گہری توجہ کے کہاں کُھلتے ہیں اسرار
ممکن ہے بتا پاؤں جو خلوت ہو میسّر
کیوں رہتا ہوں ہر آن میں خوشبو کا طلب گار



تم نے جو کچھ جانا اوروں سے جانا
تم خود میرے بارے کتنا جانتے ہو
دیکھو! پہلے جانو، سمجھو پھر بولو
بن سمجھے بن جانے بولتے جاتے ہو



تھے بہت مقروض ہم اک شوخ کے
ہم نے سب القاب واپس کر دیے
منتظر آنکھیں اذیّت میں رہیں
ہم نے اس کے خواب واپس کر دیے



جب اٹھاتا ہوں قلم تو ہونے لگتا ہے گماں
شعر کی تفہیم سے کوئی ہراساں ہے ابھی
لفظ پیہم دستکیں دیتے ہیں در کھلتا نہیں
جانے میری نظم کیوں مجھ سے گریزاں ہے ابھی



جہاں پر تھا تسلط خامشی کا
وہاں کیا کام ہوتا گفتگو سے
تھی ایسی چاک دامانی ہماری
رفوگر تھک گئے کارِ رفو سے



حسن اک آب دار موتی ہے
میں کہاں موجبِ تخلّف ہوں
مجھ سے ملتے ہوئے خیال رہے
ایک شاعر ہوں بے تکلّف ہوں



دل کے معاملات کا اپنا نصاب ہے
اپنی طرف سے کوئی تصرف نہ کیجیے
جو بارگاہِ عشق میں ہیں معتکف جناب
ان کو پکارنے کا تکلف نہ کیجیے



دونوں طرف نہیں ہے تو کیا اک طرف تو ہے
پردہ اٹھا سلوک کے گہنے سجا کے بیٹھ
ہے اس کی راکھ میں بھی نہاں زندگی کا راز
اس جلتی بجھتی آگ کے پہلو میں آ کے بیٹھ



دیارِ شوق سے پہلو تہی کرتا ہوا گزرا
وہ کم اندیش خوشبو کی حقیقت کو نہیں سمجھا
وہ شاید جذبہ و احساس کی دنیا سے بدظن ہے
وہ وسعت کو نہیں سمجھا محبت کو نہیں سمجھا



راحت کا استعارہ ہے خوشبو بھرا وجود
اس منتشر مزاج کو شاید نہیں خبر
مائل بہ التفات بھی ہے گو مگر اسے
اندر کا خوف ہونے نہیں دیتا با ثمر



رہِ وفا کے مسافر کی مشکلیں ہیں الگ
فراق جھیلنا آنکھوں کو باوضو رکھنا
دعائیں مانگنا اٹھ اٹھ کے پچھلی راتوں میں
جو دسترس میں نہیں اس کی آرزو رکھنا



رہنے دے میری خاک کو ہی میرا پیرہن
عریاں بدن ہوں یوں مجھے بے خانماں نہ کر
مجھ کو وطن کے ہر گلی کوچے سے عشق ہے
اے کم لحاظ! میری لگن رائیگاں نہ کر



روبرو آ کہ تجھے پوری طرح دیکھ تو لوں
آنکھ کی پتلی میں حیرت ہے مجسّم کب سے
منکشف ہو کے مجھے اذنِ پزیرائی دے
مضطرب ہے مرے ہونٹوں پہ تبسّم کب سے



زندگی سے ہو رہا ہوں ہمکلام
خامشی آئی ہے لینے امتحاں
ذات کے معبد میں ہوں میں معتکف
ہے کوئی تصویر پیکر حرزِ جاں



ستاروں کی طرح ہر آن ہم گردش میں رہتے ہیں
جہاں اب دیکھتے ہو تم وہاں پر اب نہیں ہیں ہم
جہاں اک اور ہے جس میں بہت کچھ ہے تصرّف میں
اسی اجلے جہاں کے تخت پر مسند نشیں ہیں ہم



کتنی شکلیں ہیں تری اے تیرگی!
سب کے سب منظر ہیں دھندلائے ہوئے
کس ستم گر کی ہے تو پالی ہوئی
اجلے چہرے بھی ہیں گدلائے ہوئے



کچھ نہیں کہنے کو میرے پاس جب تو کیا کہوں
ہاں مگر اک چپ میں ہے موجود میری داستاں
دور تک پھیلی ہوئی اک دھند ہے اور دھند میں
ہو گیا ہے گم کہیں پر میرے خوابوں کا جہاں



کر لیا تسلیم سب کچھ ہم نے بے چون و چرا
طے کیے اس نے ضوابط طے کیے اس نے اصول
منسلک رہنا ہے پیہم ایک مرکز سے ہمیں
زندگی کا ہر تقاضا کر لیا ہم نے قبول



کم التفاتیاں تری اپنی جگہ مگر
ہم تیرے لطفِ خاص کے مقروض ہیں ابھی
دیکھو بصد نیاز کھڑے ہیں کنارے آب
ہم تشنگی کے باب میں معروض ہیں ابھی



کہیں محوِ تماشا شہر یاری
کہیں پلتی ہوئی آتش فشانی
مؤرخ کی سمجھ سے بالا تر ہے
یہ سچ اور جھوٹ کے یُدّھ کی کہانی



کوئی تو ہے جو مجھے کھوجنے کی خواہش میں
مرے خیال کی راہداریوں میں جھانکتا ہے
ہوائیں اس کے اشاروں پہ رقص کرتی ہیں
وہ گنگ لفظوں کی پوروں میں جان ڈالتا ہے



کیا خبر کیسے کرے گی زندگی
ہم سے نادانوں کا ہنس کر اعتبار
کاش ہم پر منکشف ہوتا کوئی
ایک مدت سے ہیں محوِ انتظار



کیسی بستی ہے لوگ کیسے ہیں
رائیگانی ہی رائیگانی ہے
عام اور خاص اب ہے بے معنی
ہر تعلّق میں بد گمانی ہے



کیسے ممکن ہے کہ کھل جائے کسی پر مدّعا
معنویّت سے تہی ہر بات مبہم ہو گئی
رفتہ رفتہ خود سے ملنا اور مشکل ہو گیا
خود ستائی خود شناسی پر مقدّم ہو گئی



گہرائی و وسعت میں سمندر کی طرح ہوں
سمٹوں تو کسی سیپ میں گوہر کی طرح ہوں
رکھتا ہوں رویے میں مروّت کو مقدم
بگڑوں تو کسی کافرِ خود سر کی طرح ہوں



لوحِ احساس پہ کرتے ہیں رقم حالتِ دل
دل کی حالت کو صراحت سے بیاں کرتے ہیں
ہم تصنّع کے بناوٹ کے نہیں ہیں قائل
دل کی باتوں کو صداقت سے بیاں کرتے ہیں



طعنہ زن ہے وقت ہم پر اور ہم
جی رہے ہیں بے حسی کی زندگی
بے روش اندھے تسلّط کے سبب
بے سحر ہے بے بسی کی زندگی



ملتفت ہو رہا ہے کوئی مگر
زد میں پہچان ہو تو کیا کیجیے
رنگ بکھرے ہوئے ہیں چاروں اور
آنکھ ویران ہو تو کیا کیجیے



مہکتا ہے مرا ہر خواب اس پیکر کی خوشبو سے
وہ جس نے اپنی لوحِ جاں پہ میرا نام لکھا ہے
مری چشمِ تصوّر کا عطا کردہ ہے سو میں نے
وہی لکھا ہے جو احساس کی پوروں میں اترا ہے



جہاں احساس مقتل گاہ میں ہو
وہاں کیا کام ہے شور و فغاں کا
مہکتی سوچ کے حامل نہیں ہم
اسی باعث تسلّط ہے خزاں کا



میسّر کو مقدّم ہم نے رکھا ہی نہیں ورنہ
ہمارے روبرو رنگوں کی خوشبوؤں کی دنیا ہے
ہماری دسترس میں صبح کا شاداب منظر ہے
بہت کچھ ہے جو بن مانگے ہمیں قدرت نے بخشا ہے



میں اپنا آپ حوالہ ہوں اتنا دھیان رہے
کسی قطار میں مجھ کو شمار مت کرنا
میں اپنی مٹی کی خوشبو سے ہی مہکتا ہوں
کسی بھی طور مجھے بے وقار مت کرنا



جانے کیا موڑ تھا کس سوچ میں گم تھے راہی
جو جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں موجود نہ تھا
خوف ہی خوف تھا ویران گزرگاہیں تھیں
پاؤں اٹھتے نہ تھے گو راستہ مسدود نہ تھا



نعمت کی نا قدری کرنے والے لوگ
راحت کے احساس سے عاری ہو جاتے ہیں
خواب سہانے چھن جائیں جب آنکھوں سے
پچھتاوے کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں



نکلی ہے دھوپ اوڑھ کے یخ بستگی کی شال
ممکن نہیں کہ مل سکے اس کی کوئی مثال
حدّت طلب مزاج کی بے تابیاں تو دیکھ
پر تولنے لگا ہے مرا طائرِ خیال



نہیں معلوم ایسا کیا تھا موسم کے رویے میں
کسی نے بے سبب خود کو مقفّل کر لیا خود میں
گریزاں ہو کے قدر و منزلت سے بے نیازانہ
کسی نے ذات کو اپنی مکمّل کر لیا خود میں



نئے شعور کی رو سے بدلنے والا ہے
مرے وطن کا حوالہ مرے وطن کا مزاج
زیادہ دور نہیں ہے نئی سحر کا ظہور
کہ آ گیا بالآخر جنوں کی زد میں نراج



ہر تمنا پہ خاک ڈالی گئی
ہر تقاضے کو بے وقار کیا
زندگی تجھ سے پوچھ سکتے ہیں
تو نے کیوں اتنا بے قرار کیا



ہم پہ کیوں مہربان ہو فطرت
اجلے رستوں پہ چل نہیں پائے
نعمتیں بھی تھیں اور مواقع بھی
ہم مقدّر بدل نہیں پائے



ہم چاک گریبان رہے برسوں مگر اب
ہر چاک کو سینے کا ہنر سیکھ لیا ہے
اے گردشِ حالات ہمیں دیکھ کہ ہم نے
ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے



ہم سفر میں ہیں مگر ذوقِ سفر نا پید ہے
گمرہی ایسی ہے ایمان و یقیں خطرے میں ہے
جانے کیا افتاد ہے ہر آن لگتا ہے ہمیں
موسمِ گل بے اماں ہے آرزو سکتے میں ہے



ہم غم طلب مہان ہیں ہم نے ہر ایک غم
پالا ہے صبح و شام بڑے اہتمام سے
کس طرح مہربان ہوں ہم پر لطافتیں
ہم بدگمان رہتے ہیں ہر خاص و عام سے



ہم فقط ایک بات جانتے ہیں
وہ جو سب کا ہے وہ ہمارا نہیں
ایک تخصیص کے ہیں حامل ہم
ہم سے ملنے میں کچھ خسارا نہیں



ہم گرد میں لپٹے ہوئے فریاد کناں ہیں
ہے کوئی جو دکھ درد کی یہ گرد اتارے
اے فیض رساں دیکھ کسی طور ادھر بھی
ہم پیاس سے بے حال ہیں دریا کے کنارے



ہمارا لمسِ عقیدت نہیں تھا آلودہ
ہماری چشمِ تصوّر پہ کیوں لگا پہرا
ہم اہلِ دل تھے تو پھر دل کی بات بھی سنتے
ہمارے ملنے کا پل کیسے مختصر ٹھہرا



ہمیں تسلیم ہے سب کچھ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں
ہم اپنے بڑھتے قدموں کو دفعتاً روک لیتے ہیں
یہ کیا افتاد ہے ہم کہہ نہیں پاتے جو کہنا ہو
ہم آخر کیوں خود اپنے آپ کو تکلیف دیتے ہیں



ہمیں سدھرنا تھا جتنا سدھر چکے ہیں ہم
اب ہم سے اور سدھرنے کا مت تقاضا کر
جو ہو سکے تو کسی طور اس طرف سے گزر
پلٹ کے آنے کا بارِ دگر ارادہ کر



وقت کج رفتار کی رفتار کا عالم نہ پوچھ
سانس لینے کے لیے رکنے کی مہلت بھی نہیں
اپنی مرضی کے کسی منظر کا کیا پیچھا کریں
آنکھ کو اب خواب بننے کی سہولت بھی نہیں



وہ آرزو ہے بھولی ہوئی آرزو نہیں
کس کو خبر ہے کب سے ہے اپنے حصار میں
رہتی ہے اپنے آپ میں سرشار اس طرح
جنگل میں جیسے پھول کھلا ہو بہار میں



وہ جو جھوٹے ہیں سر سے پاؤں تلک
ہم انہیں معتبر سمجھتے ہیں
سیدھے رستے سے ہیں جو بھٹکے ہوئے
ہم انہیں راہبر سمجھتے ہیں



وہ زائچہ شناس ہے اس پر عیاں ہے سب
اس کو خبر ہے جو بھی مرے زائچے میں ہے
سانسوں کا زیر و بم ہی ہے تفسیرِ زندگی
اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ حاشیے میں ہے



وہ عجلت میں تھا یا الجھا ہوا تھا
وہ بن بتلائے رخصت ہو گیا تھا
اگر کچھ دیر رکتا تو اسے ہم
بتاتے ہم نے کیا سوچا ہوا تھا



وہ ہوتا گر شناسا رتجگوں سے
تو تب کھلتی شبِ غم کی طوالت
ذرا سی دیر وہ رکتا تو اس کو
بتا دیتیں یہ آنکھیں دل کی حالت



یہ بھی کیا بات اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں
جس کو اک اجلی رفاقت کا بھی کچھ پاس نہیں
ریشمی لہجہ اسے کیسے کرے گا شاداب
جس کا دل لطف وعنایت کے لیے خاص نہیں



یہ خامشی ہے جو کرتی ہے منکشف دل پر
وہ سارے بھید جو کھلتے نہیں ہیں باتوں سے
مرے خیال کی لو سے پگھل بھی سکتا ہے
وہ برف زاد جو اوجھل ہے میری آنکھوں سے



یہ کس کافر حسینہ کی ہوئی ہے ہم نوا فطرت
کہ فصلِ گل میں ہر منظر ملن کے گیت گاتا ہے
فضاؤں میں عجب مستی بھری خوشبوئیں شامل ہیں
کوئی تو ہے جو آنکھوں میں حسیں سپنے سجاتا ہے



یہیں کہیں کوئی موجود تھا خدا معلوم
ذرا سی دیر میں منظر بدل گیا کیسے
عجیب درد اٹھا ہے کسی کے جانے سے
کسے بتائیں کہ یہ دل سنبھل گیا کیسے



اتنے بے رحم تقاضوں کا تقاضا ہے کہ ہم
ایک دوجے کو ملیں ایسے کہ ہم ہو جائیں
دوریاں ساری کسی طور مٹا دیں مل کر
معجزہ ایسا ہو یہ فاصلے کم ہو جائیں



اجالوں سے تہی ہیں سارے منظر
جہاں جانا ہو جا سکتے نہیں ہیں
کسی کے کام آنا چاہیں بھی تو
کسی کے کام آ سکتے نہیں ہیں



اداس لوگوں کا یہ مسئلہ بھی مسئلہ ہے
وہ جان ہی نہیں پاتے کہ کیوں اداس ہیں وہ
بھٹکتے رہتے ہیں بے سمت بے خیالی میں
اسی کو ڈھونڈتے ہیں جس کے آس پاس ہیں وہ



اربابِ حل و عقد ذرا اک نظر ادھر
کاسہ بدست لوگ کھڑے ہیں قطار میں
اس درجہ زندگی میں تو رسوا کبھی نہ تھے
جمہور اب نہیں ہے کسی بھی شمار میں



اس درجہ جھوٹ کی یہاں فرما روائی ہے
سچ بولنے لگا تو مرے ہونٹ سل گئے
یہ کون لکھ رہا ہے مری داستاں یہاں
کس کو حقوق میری کہانی کے مل گئے



اس طرح دار کو ابھی شاید خبر نہیں
میرا یقین رکھتا ہے ہر دم جواں مجھے
آنے دو میرے روبرو اس کو کسی طرح
لینا ہے اپنے ضبط کا اب امتحاں مجھے



اس عہدِ ستم ساز سے شکوہ بھی عبث ہے
ہم جیسے یہاں کتنے ہی مصلوب ہوئے ہیں
چپ چاپ کٹہرے میں کھڑے سوچ رہے ہیں
کس جرم کی پاداش میں معتوب ہوئے ہیں



اس نے کیا ہے یوں مرے غم سے معانقہ
میرے بدن کی کیمیا تبدیل ہو گئی
اتری یوں پور پور میں تہذیب ہمرہی
بکھری ہوئی حیات کی تکمیل ہو گئی



اک شخص کے حوالے سے کرنا تھی گفتگو
لیکن مری زبان کی لکنت نہیں گئی
الفاظ میرے ہونٹوں پہ دم توڑ نے لگے
بے لفظ بات کرنے کی عادت نہیں گئی



آنکھوں کی پتلیوں میں ہیں ماضی کے کچھ نقوش
چہرے پہ ہے جمی ہوئی لا حاصلی کی دھول
کافی دنوں کے بعد محبت کے دیس میں
کفارہ دینے آئی ہے بیتے دنوں کی بھول



ایک یدّ ھ ہے دیکھے ان دیکھوں کے بیچ
دیکھیے ہوتا ہے کیسا اختتام
اب نتیجہ خیز ہونا ہے اسے
ہو رہا ہے دھیرے دھیرے اہتمام



انگڑائی لے رہی ہے رگوں میں لہو کی موج
پلنے لگا ہے جسم کی پوروں میں اضطراب
ہونے کو پھر سے ہے کوئی مہتاب ضو فشاں
لو دے رہا ہے آنکھ کی پتلی میں ایک خواب



ایک شہزادی نے شہزادے سے یوں شکوہ کیا
کس لیے ہوتے نہیں ہیں آپ مجھ سے ملتفت
کیا سبب ہے دوریاں ہیں کیوں ہمارے درمیاں
کیوں ملن کے روز و شب ہوتے نہیں ہیں منضبط



بارگاہِ عشق میں ہے مستقل میرا قیام
لمحہ لمحہ اس لیے تو باخبر رہتا ہوں میں
صبح دم بادِ صبا آ کر جگاتی ہے مجھے
یوں سحر خیزی کے باعث باثمر رہتا ہوں میں



باہمی احساس کرتا ہے دلوں کو تابناک
ہے محبت سے فروزاں یہ جہانِ رنگ و بو
منظروں سے ماورا بھی ہیں کہیں پر رابطے
لمحہ لمحہ جس جگہ کرتی ہیں روحیں گفتگو



بے مقصد دیواریں چن کر کیا پایا
صحن کی عظمت کو ہم نے مسمار کیا
بے وقعت پھرتے ہیں پوری دنیا میں
ہم نے جھوٹ فریب کا کارو بار کیا



بے یقینی بھی یقیں ساتھ لیے پھرتا ہے
عالمِ قحط میں ہیں ہم کہ فراوانی ہے
مسکراتے ہوئے چہروں سے خوشی غائب ہے
ذکر اتنا ہے محبت کا کہ حیرانی ہے



پھول کھلتے ہیں مگر ضعفِ بصارت ایسا
ہم پہ کھلتے ہی نہیں حسنِ خدا داد کے رنگ
کیف آور ہیں مناظر یہ بجا ہے لیکن
لطف لینے ہمیں دیتے نہیں افتاد کے رنگ



تبسم زیرِ لب ، آنکھوں میں مستی
قیامت کے ہیں یہ آثار جاناں
کوئی اس میکدے میں کیسے آئے
جہاں ابرو ہیں پہرے دار جاناں



ترے بدن میں محبت قیام کیسے کرے
کہ تیرے ساتھ تری بے دلی کا سایا ہے
یہ کھلتے پھول تجھے کیوں عطا کریں خوشبو
تو آرزو کے جزیرے سے لوٹ آیا ہے



ترے تقاضے میں شامل ہے تیرے من کا علاج
سوال کر ترے اندر کی یہ گھٹن کم ہو
یہ خامشی تو مداوا نہیں فرار ہے یہ
طلب بغیر تو ممکن نہیں جلن کم ہو



ترے رخسار و لب کی دلکشی ہر دم رہے قائم
حسیں موسم کا سارا اجلا پن تیرا مقدر ہو
سکوں آمیز ہوں تیری سبھی صبحیں تری شامیں
متاعِ شاعری تیرا جمالِ روح پرور ہو



تو میرے ساتھ کسی روز چل، دکھاؤں تجھے
میں جس جگہ ہوں وہاں روشنی ہی روشنی ہے
میں شام ڈھلتے ہی خوشبوئیں اوڑھ لیتا ہوں
پھر اس کے بعد مجھے کہکشاں اجالتی ہے



ٹوٹے ہوئے پندار کی قاشوں کو سمیٹے
ہم اپنی خطاؤں کی سزا کاٹ رہے ہیں
امید لگائے نہ کوئی سائے کی ، ہم لوگ
جو پیڑ ہوا اونچا ذرا کاٹ رہے ہیں



جو بھی احساس کی وادی میں قدم رکھتا ہے
زندگی اس کو نیا روپ عطا کرتی ہے
اجلے موسم اسے دیتے ہیں صدائیں ہردم
زرد رت اس کے تبسّم سے بہت ڈرتی ہے



جو گزرتی ہے ہجر میں اس کو
کب ہے آسان مستقل لکھنا
لکھنا چاہا تو تب ہوا معلوم
جان لیوا ہے حالِ دل لکھنا



جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں پایا مگر میں نے
جو لکھا ہے اسے دل سے گواہی لے کے لکھا ہے
مجھے ہر لفظ کی تاثیر کا ادراک ہے میں نے
متاعِ فکر کو لطفِ فراواں دے کے لکھا ہے



جو منظر سے الگ ہیں ان سے واقف
وطن کا بچہ بچہ ہو چکا ہے
پسِ پردہ حقائق اور ہیں کچھ
جو ہے موجود وقعت کھو چکا ہے



خدا معلوم کیا حکمت ہے اس میں
یہ خلقت ظلم سارے سہہ رہی ہے
حدیں سب توڑتے جاتے ہو سوچو
بس اب اک آخری حد رہ گئی ہے



خوابوں کو بے چہرہ کیسے کر پاؤ گے
خوابوں کا مفہوم ہی بدلا جا سکتا ہے
جلتی بجھتی آنکھیں تم سے پوچھتی ہیں
کیا خوابوں کے بن بھی سوچا جا سکتا ہے



دیارِ عشق میں وہ شوخ اترا تو ہے اب دیکھیں
اسے کیسے جنوں آمیز ہجرت راس آتی ہے
یہاں پر رہنے والے بے گھری کا درد سہتے ہیں
فقط اہلِ نظر کو یہ مسافت راس آتی ہے



رات کٹنے کے منتظر ہیں ہم
رات ضد پر اَڑی ہوئی ہے ابھی
کون توڑے غرور ظلمت کا
سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے ابھی



رگِ احساس میں کیسے نہ اترے
یہ دل کی بات بے وقعت نہیں ہے
یقیں کی روشنی سے ہے منور
محبت سی کوئی نعمت نہیں ہے



رنگ جتنے تھے میسّر بھر دیے تصویر میں
کیا ہے رنگوں کا تناسب تو نے کیوں دیکھا نہیں
اے مصوّر تیری یہ عجلت پسندی خوب ہے
کون دیکھے گا ترا شہکار کیوں سوچا نہیں



روشنی ہم کو میسّر ہو نہ ہو
ہم کو اب تاریکیوں سے کد نہیں
آپ اپنے بام و در روشن رکھیں
آپ پر تو لاگو کوئی حدّ نہیں



زندگی پھولوں سے کرتی ہے سواگت اس کا
خواہشیں اس کے لیے خواب بُنا کرتی ہیں
زیبِ تن کرتا ہے جب کوئی محبت کا لباس
خوشبوئیں اس کے تعاقب کو نکل پڑتی ہیں



سر پیٹتی ہے بے کلی بالوں کو کھول کر
کیوں مضمحل ہے آرزو کوئے حبیب میں
ہونے دے منکشف اسے جو منکشف نہیں
یہ خواب حیرتیں کیوں ہیں نصیب میں



سیاہ رات میں جلتا رہا بدن کا چراغ
میں لمحہ لمحہ اجالے کے ہم رکاب رہا
عجیب بھیگی ہوئی رت تھی روبرو میرے
میں جل رہا تھا مگر صورتِ گلاب رہا



شعر گوئی کو کم خیال نہ کر
یہ کہانی ہے گنگ جذبوں کی
ہم نے وہ بھی لکھا جو لکھتے سمے
ڈوب جاتی تھی نبض لفظوں کی



عجیب بات ہے دونوں ہیں خوف کی زد میں
وہ خود بھی ڈرنے لگا ہے مجھے ڈراتے ہوئے
ہے اس کے لہجے میں اک طنطنہ مگر پھر بھی
وہ بے سکون سا لگتا ہے مسکراتے ہوئے



کس طرح سے ہو نواحِ جاں میں خوشبو کا گزر
ہم سے جب تحسینِ حسنِ یار ہو پاتی نہیں
منسلک تہذیبِ رعنائی سے ہے لطفِ عمیق
بے دلی کا راج ہو تو کوئی شے بھاتی نہیں



کسی صورت عطا ہو جائے مجھ کو فہم رنگوں کا
اسے تصویر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں میں
یہ سندر مو قلم یہ کینوس اور لطف کی بارش
یوں لگتا ہے محبت میں عبادت کر رہا ہوں میں



کسی کے خال و خد کی روشنی سے
اندھیروں کو مسخر کر رہا ہوں
بصارت سے تہی تھیں میری آنکھیں
میں آنکھوں میں اجالے بھر رہا ہوں



کھینچ لیتی ہے بدن کی شاخ سے سارا نمو
آدمی سرسبز ہو بھی تو ہرا لگتا نہیں
نارسائی کی اذیت ہے مثالِ زرد بیل
ایسے موسم میں تو کوئی پھول کھل سکتا نہیں



گھٹن ہے اور مسلّط ہے ایک مدت سے
یہ کس لیے مرا موسم کبھی بدلتا نہیں
دھوئیں کے پار کبھی دیکھ تو کھلے تم پر
یہ کون ہے جو سلگتا ہے اور جلتا نہیں



لفظ تو بعد میں تخلیق ہوئے تھے پہلے
گنگ مٹی کو تقدّس ملا تعظیم ملی
معتبر کتنا تھا بے لفظ کہانی کا وجود
جس کی نسبت سے مرے لفظوں کو تکریم ملی



لکھنا چاہا ہے خوشی کا گیت جب
منہ چڑانے آ گئی افسردگی
منظروں میں دھول اڑتی دیکھ کر
ذہن و دل پر چھا گئی افسردگی



مقدّر میں مسلسل رتجگے ہیں
ہمارے خواب ہجرت کر گئے ہیں
چلن بدلا ہے ایسا موسموں کا
مکیں اپنے گھروں سے ڈر گئے ہیں



بہتے ہوئے لہو سے ترا رنگ سرخ ہے
خستہ بدن پہ یہ قبا تیرے ہی نام کیوں
کیوں رزق بن گئے ہیں درندوں کا نونہال
اے ارضِ شام! شام سے پہلے یہ شام کیوں



بھولنے والے میں ترا نام نہیں لے سکتا
چھپ کے لیتا ہوں سر عام نہیں لے سکتا
تجھ پہ حرف آئے کسی طور گوارا کب ہے
میں کسی طور یہ الزام نہیں لے سکتا



بوجھ کوئی اٹھا نہیں پایا
جانے احساس کتنا بھاری تھا
آنکھ منظر بدل کے دیکھتی تھی
منظروں پہ سکوت طاری تھا



بےتکلّف ہم سے وہ اور ان سے ہم ہوتے نہیں
درمیاں اک ہم کا صیغہ مستقل دیوار ہے
دونوں کرتے رہتے ہیں اپنی انا کی پرورش
اس ریاضت کا ثمر ہی باعثِ آزار ہے



بے نیازی میں اِک نیاز بھی ہے
زندگی جس کے گرد گھومتی ہے
ایک منظر نیا اُبھرتا ہے
جب ہَوا بادباں کو چومتی ہے



بے نیازی ہو گئی پل کر جواں
ناز برداری نے پالا ہے اِسے
عارض و لب اور دلکش ہو گئے
یوں محبت نے اجالا ہے اِسے



بے یقیں سے لگ رہے ہیں حیرتوں کے درمیاں
قوم کے افراد کو اک حوصلہ درکار ہے
بے حسی کی چادریں اوڑھے ہوئے ہیں رہنما
سرزمینِ پاک ان کے بوجھ سے بے کار ہے



بے کار ہے یہ نقش مٹانے کی کوششیں
خس پوش آرزوئیں بھی مرتی نہیں کبھی
ہلکی سی دستکوں کا بھی دیتی ہیں یہ جواب
لا حاصلی کے خوف سے ڈرتی نہیں کبھی



پاسِ وابستگی رہے نہ رہے
حسن کو داستان ہونا ہے
موسمِ ہجر ہو یا وصل کی رت
عشق کا امتحان ہونا ہے



پختہ تھا میں کسی نے مجھے خام کر دیا
پھر اس پہ یہ ستم کہ سر عام کر دیا
لکھا کچھ اس ادا سے مرا نام لوح پر
سارے جہاں کا درد مرے نام کر دیا



پرندہ رات بھر بے کل رہا ہے
کہیں طوفان کوئی پل رہا ہے
نہیں ہے طاقتِ پرواز باقی
فقط سانسوں کا دھندا چل رہا ہے



پزیرائی کی خوشبو سے معطر ہو گئے جذبے
وفا احساس کے ماتھے پہ یوں تحریر کی اس نے
قلم اور نوٹ بک کا قیمتی تحفہ مجھے بھیجا
مرے الفاظ کی کچھ اس طرح توقیر کی اس نے



پسِ احساس بھی احساس کی اک ایسی صورت ہے
جو رنگوں، خوشبوؤں، اجلے حوالوں سے عبارت ہے
یہیں سے پھوٹتے ہیں سارے چشمے غمگساری کے
اسی کے فیض سے قائم مرے فن کی ریاضت ہے



پلٹ کر اک نظر دیکھا تھا اس نے
وہ منظر چشمِ تر میں رہ گیا ہے
بچھڑتے وقت اس کی آنکھ نم تھی
وہ بن بولے بہت کچھ کہہ گیا ہے



پلکوں کے آگے سج گئیں شفاف جھالریں
آنکھوں میں کس کے ہجر نے ساون بسا دیے
وہ کون تھا جو دھڑکنیں بھی ساتھ لے گیا
کس نے ملن کی آس کے امکاں مٹا دیے



پھر چلا آیا ہے کوئی بام پر
پھر اتر آیا ہے آنکھوں میں خمار
پھر کسی نے اپنا جادو کر دیا
پھر کوئی ہونے لگا ہے بے قرار



پوچھا نہیں، بتایا نہیں اس نے حالِ دل
لگتا ہے جیسے اس نے فراموش کر دیا
کیا کیا نہیں تھے تاروں میں نغماتِ دلپذیر
صد حیف اس نے ساز ہی خاموش کر دیا



پیشِ نظر ہے آج بھی پھولوں کی رہگزر
لیکن خبر نہیں ہے کہاں ہے وہ ہمسفر
مدت ہوئی ہے کوئی بھی دستک نہیں ہوئی
سنسان لگ رہے ہیں رفاقت کے بام و در



تا حدِّ نظر بھیڑ ہے ٹکراؤ ہے پیہم
یہ شہرِ ستم ہے مری جاں گاؤں نہیں ہے
آ بیٹھ مری آنکھ کے خیمے میں کہ ہر سو
جلتے ہوئے منظر ہیں کہیں چھاؤں نہیں ہے



خوشبوؤں کے دیار میں رکھا
چاندنی کے حصار میں رکھا
اس کے لہجے کی دلربائی نے
مجھ کو گہرے خمار میں رکھا



تقاضا تجھ سے ملنے کا تو ہے لیکن بس اتنا سا
جو تجھ سے بات کہنا چاہتا ہوں ، بات ہو جائے
تجھے ملنے کی عجلت میں کسی دن کاش ایسا ہو
کہ میں جھنجھلا کے دن کو رات کہہ دوں، رات ہو جائے



تخیّل میں جو ہر لمحہ مجھے محسوس ہوتا ہے
وہ پھولوں سا حسیں ہے صورتِ خوشبو معطر ہے
اسی کے خواب کی تاثیر ہے میری رگِ جاں میں
اسی کے لمس کا احساس ہر شے سے فزوں تر ہے



ترے سندر بدن میں اک نیا احساس بھر دیتا
تصوّر کا حقیقت سے کبھی گر رابطہ ہوتا
ترے عارض کی نرمی میرے ہونٹوں میں اتر جاتی
اگر اس پیاس کی تقدیر میں بھی معجزہ ہوتا



تری معجز نمائی کام آئے
مسیحا اب کوئی احسان کر دو
مجھے وہ بھولنا چاہے نہ بھولے
اسے ایسا وظیفہ دان کر دو



تصوّر میں جو اک قوسِ قزح ہے
ہیں اس کے رنگ اس کے پیرہن سے
رگِ جاں میں اترتی جا رہی ہے
مہک اٹھی ہے جو اس کے بدن سے



تم نے اک عمر گزاری ہے اسی زنداں میں
کیسے سمجھاؤں تمہیں ذات سے باہر کیا ہے
تم نے اوڑھی ہے بصد شوق سیہ رات تمہیں
کیسے معلوم ہو اس رات سے باہر کیا ہے



تم سے کوئی تعلق خاطر نہیں رہا
منہ پھیر کر یہ اس نے سنایا ہے فیصلہ
جلتا رہے گا میرا بدن خامشی کے ساتھ
تجویز کر گیا ہے وہ میرے لیے سزا



تم کون سے احساسِ تفاخر پہ ہو نازاں
لے جاؤ یہ سب جبہ و دستار کہیں اور
یہ عشق کی بستی ہے یہاں ان کا نہیں کام
مل جائیں گے اس ڈھب کے پرستار کہیں اور



تمہارے خواب سے اک خواب پھوٹے
مری آنکھوں کی بھی تقدیر بدلے
تمہاری ذات کا مرکز بنوں میں
مرے ہاتھوں کی بھی تحریر بدلے



تھی چاند میں بھی اس کے حوالے سے دلکشی
اس کے بغیر چاند بے مایہ لگا مجھے
اس طرح توڑ کر مجھے گزری شبِ فراق
میرا وجود صورتِ سایہ لگا مجھے



تہی دامن نہیں تھے ہو گئے ہیں
بہت کچھ چھوڑ آئے ہیں کہیں پر
کوئی اب بھی کہیں محوِ سفر ہے
کوئی چپ چاپ بیٹھا ہے وہیں پر



تھے کبھی اس سے رابطے اپنے
اب نہ وہ ہے نہ اس کی باتیں ہیں
حاصلِ زیست ہیں وہی لمحے
جن سے وابستہ اس کی یادیں ہیں



تہی ہے دامنِ امید کب سے
اسے ہم کب سے بھرنے میں لگے ہیں
ریاضت رائیگاں ہونے نہ پائے
یقیں تعمیر کرنے میں لگے ہیں



وہ مجھے بھول بھی تو سکتا ہے
کب بھلا یہ مرے گمان میں تھا
میں محبت پہ ناز کرتا تھا
کیا خبر تھی میں امتحان میں تھا



تو مرے ساتھ چل نہ چل لیکن
میرے جذبوں کا احترام تو کر
میں ادھر بھول کر نہ آؤں گا
بندہ پرور کہیں قیام تو کر



تُو نے دیکھا ہی نہیں آنکھ میں اُترا ہوا غم
تُو نہیں جانتا یہ درد کہانی کیا ہے
تُو نے دیکھا ہے کنارے سے یہ سیلاب، تجھے
کیسے سمجھاؤں کہ دریا کی روانی کیا ہے



توجہ مرتکز ہو بھی تو کیسے
ہماری جستجو گھٹنے لگی ہے
ہمیں رفتار کم کرنا پڑے گی
مناظر سے نظر ہٹنے لگی ہے



توجّہ مرتکز رہتی تھی جس کی
وہ خوش اوقات بھی بکھرا ہوا ہے
تخّیل پر ہے غلبہ زرد رت کا
قلم قرطاس سے الجھا ہوا ہے



میرے لفظوں میں خال وخد ہیں ترے
تجھ کو تصویر کر رہا ہوں میں
رنگ سارے ہیں گو تصّرف میں
کچھ نہ کچھ پھر بھی ڈر رہا ہوں میں



تیرے ہر روپ سے تقدیس کی کرنیں پھوٹیں
تیری آنکھوں میں نئے خوابوں کا امکان رہے
تیری بے پایاں محبت بھرے احساس میں رنگ
تیرے ہونٹوں پہ سحر بانٹتی مسکان رہے



تیقّن آشنا ہونے کو ہے دل
کہ حیرت منکشف ہونے لگی ہے
حقیقت کیا تھی اب اس کی حقیقت
ذرا سی مختلف ہونے لگی ہے



ٹوٹ جائیں نہ رابطے تجھ سے
زندگی اور امتحان نہ لے
ہو بھی سکتا ہے منتظر کوئی
دیکھ مجھ سے مرا گمان نہ لے



جانے کیوں رہتا ہے مجھ سے بدگماں
میری اتنی چاہتوں کے با وجود
کر نہیں پایا اسے میں مطمئن
اپنی ساری کوششوں کے با وجود



جب کبھی تنہائی دے گی دستکیں
بے تحاشا یاد میری آئے گی
آنکھ میں اترے گی ساون کی طلب
رفتہ رفتہ پیاس بڑھتی جائے گی



جذبہ و احساس سے ہو کر تہی
لفظ کھو دیتے ہیں اپنی آبرو
کوششِ پیہم سے بھی جلتا نہیں
مضمحل دل میں چراغِ آرزو



جس سہولت سے، سلیقے سے اسے چاہا تھا
اس سہولت سے ،سلیقے سے بھلانا ہے اسے
کام مشکل ہے مگر کام تو کرنا ہوگا
ٹوٹ کر کیسے بکھرتے ہیں بتانا ہے اسے



جس کو پوچھو اسے شکایت ہے
کوئی یہ بھید جانتا ہی نہیں
زندگی کتنی خوبصورت ہے
ہے، مگر کوئی مانتا ہی نہیں



جس نے بے وجہ مری آنکھ سے منظر چھینے
وہ کوئی اور نہیں تھا وہ مرا اپنا تھا
لے گیا لمحۂ سفاک اسے ساتھ کہیں
جس کے ملنے سے مجھے اپنا پتا ملتا تھا



جستجو بے ثمر رہی کیوں ہے
خواب تعبیر سے تہی کیوں ہے
عمر گزری ہے اس تذبذب میں
خواہشِ وصل ان کہی کیوں ہے



جگنو کوئی ستارہ کوئی کہکشاں جناب
لے آیئے بنا کے کوئی اور زائچہ
سر پر سیاہ رات ہے لازم ہے احتیاط
رکھیے حضور روشنی کے ساتھ رابطہ



جلوۂ صد رنگ میں اک رنگ ہے
عالمِ حیرت بھی جس پہ دنگ ہے
وہ اجالا ہے محبت کا فسوں
اس کے دم سے تیری میری جنگ ہے



جنوں خیزی کی اپنی لذّتیں ہیں
کبھی خود سے بغاوت کر کے دیکھو
رگوں میں خون جم جانے سے پہلے
کسی صورت محبت کر کے دیکھو



جھوٹ بولا گیا مہارت سے
سچ کے ماتھے پہ اب پسینہ ہے
جو بھی کالا تھا ہو رہا ہے سفید
کس فسوں گر کا یہ دفینہ ہے



جو باضمیر لوگ ہیں وہ جان کر جئیں
ہر زر پرست فتنہ خو ہے فتنہ ساز ہے
اپنا مفاد سامنے رکھتا ہے ہر گھڑی
حد درجہ اس حوالے سے وہ بد لحاظ ہے



جو بھی کہنا چاہو مجھ سے کہہ سکتے ہو
تم مرے شعروں میں زندہ رہ سکتے ہو
میں تو اپنی موج میں بہتا جاتا ہوں
تم بھی مجھ میں ناؤ بن کر بہہ سکتے ہو



جو بھی ہونا ہے اب وہ ہو جائے
سارے رشتوں سے باخبر ہیں ہم
بے یقینی سے خوش گمانی تک
آپ اپنے ہی ہمسفر ہیں ہم



جو دل کی بات ہے اس بات کو دل میں ہی رہنے دیں
بدلتے موسموں کے ذائقوں پر گفتگو کر لیں
سلیقہ سیکھ لیں اس درد کو محسوس کرنے کا
جدا ہونے سے پہلے آؤ آنکھیں با وضو کر لیں



چاک دامن کے سِل بھی سکتے ہیں
ہم کسی طور مل بھی سکتے ہیں
اے خزاں رت کو اوڑھنے والے
پھول صحرا میں کھل بھی سکتے ہیں



چاندنی راتوں سے ہم رشتہ ہے یہ
منظروں میں کیف ہے اس ساز سے
بانسری کی لے میں جادو ہے کوئی
دل مچل اٹھتے ہیں اس آواز سے



چاندنی شب اور ساحل کی ہوا
ایسے عالم میں تمہاراساتھ ہو
دیکھتی ہوں سر پھری لہریں ہمیں
میرے ہاتھوں میں تمہارا ہاتھ ہو



چاندنی میں گھلی ہوئی خوشبو
جان و تن میں اترتی جاتی ہے
سارے منظر میں اک خمار سا ہے
یاد پلکوں پہ مسکراتی ہے



چبھن بے اعتنائی کی ابھی کم ہو نہیں پائی
یہ دل کیسے نہ مثلِ ماہیء بے آب ہو جائے
تعلّق زرد رت کو اوڑھ لے تو کیسے ممکن ہے
نویدِ فصلِ گل سے زندگی شاداب ہو جائے



چلنا ہے تو چل ساتھ مگر اتنا سمجھ لے
ہم تیز بہاؤ میں ہیں دریا کی طرح ہیں
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں کچھ خواب سہانے
ہم ساعتِ امروز میں فردا کی طرح ہیں



چھٹ جائے اگر دھند تو پھر ممکن ہے
بے چہرہ احساس کو چہرہ مل جائے
خوشبو پھیلے روحوں کو شاداب کرے
فصلِ گل ہے پھول سے کہہ دو کھل جائے



حاصلِ زیست ہیں وہی لمحے
تو نے جن کو وقار بخشا ہے
رائیگانی ہی رائیگانی تھی
دل کو تو نے قرار بخشا ہے



حسنِ احساس سے مزیّن ہوں
رنگ ،خوشبو مرا حوالہ ہے
اک ستارے کا ہے عطا کردہ
میری آنکھوں میں جو اجالا ہے



حسن جب ملتفت نہیں ہوتا
عشق بے مایہ ہونے لگتا ہے
شاخساروں سے پتے جھڑتے ہیں
پیڑ بے سایہ ہونے لگتا ہے



حسن فطرت ہے پیرہن میرا
رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے
میں محبت کی بارگہہ میں ہوں
یہ محبت مرا اجالا ہے



حسن کی بے نیازیاں نہ گئیں
عشق مائل بہ التجا نہ ہوا
منتظر آنکھ میں رہا ساون
پھر بھی موسم ہرا بھرا نہ ہوا



حقیقت ثانوی سی ہو گئی ہے
کچھ ایسے واہمے پاس آگئے ہیں
وہ اب مصروف سا رہنے لگا ہے
اسے کچھ مشغلے راس آگئے ہیں



حیات کیسے گزاری ہے نقش ہے سب کچھ
ہیں موجِ ریگ کی صورت بدن کی تحریریں
جنوں کی بخشی ہوئی ہیں جنوں سلامت ہے
سجی ہوئی ہیں جو پاؤں میں اتنی زنجیریں



حیرتوں کے درمیاں مصروف رہتا ہوں بہت
رنگِ دنیا دیکھتا ہوں ایک بچے کی طرح
وقت کی ہر ایک کروٹ سے ہے سمجھوتا مرا
کاٹتا ہوں روز و شب مہمان لمحے کی طرح



خامشی روگ ہی نہ بن جائے
بے زبانی کو مختصر رکھیے
شام ہونے میں دیر کتنی ہے
شام ہونے کی بھی خبر رکھیے



خامشی ہی خامشی ہے رابطے مفقود ہیں
دھند چھٹ جانے کے بھی امکان اب محدود ہیں
یاد کی پگڈنڈیوں پر بے حسی اگنے کے بعد
اس نگر کو جانے والے راستے مسدود ہیں



خواب آنکھوں میں لے کے آئے تھے
خواب تعبیر تک نہیں آئے
جانے اترے ہیں کس بلندی سے
پاؤں دھرتی پہ ٹک نہیں پائے



خواب تعبیر سے مشروط نہیں ہو سکتے
خواب احساس سے شاداب ہوا کرتے ہیں
مشورہ دل سے کیا دل نے کہا خاموشی
درد سہنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں



خواب روٹھے ہوئے آنکھوں سے الگ بیٹھے ہیں
دل نے ہر غم کو زمانے سے چھپا رکھا ہے
نیند آئے بھی تو کیسے کہ فصیلِ شب پر
شام سے یادوں نے کہرام مچا رکھا ہے



خوابوں میں رنگ و نور کا ، خوشبو کا راج ہے
ہر سو کسی نے پھولوں کے گجرے سجا دیے
رہتے ہیں میرے روبرو حیرت کے سلسلے
آنکھوں میں کس نے اتنے جزیرے بسا دیے



خواہش لہو میں گھل گئی اس احتیاط سے
اس دل کو حادثے کی خبر تک نہ ہو سکی
آنکھیں کسی کے ساتھ رہیں محوِ گفتگو
اور ہم کو رابطے کی خبر تک نہ ہو سکی



خوابوں کی رہگزر سے وہ گزرا تھا اس طرح
نقشِ قدم پھر اس کے مٹائے نہ جا سکے
اس نے تو ہر لحاظ سے رکھا مرا خیال
مجھ سے ہی کچھ تقاضے نبھائے نہ جا سکے



خود اپنے آپ سے پہروں رہے ہیں بیگانے
کسی کو کھو کے کچھ اس طرح خود کو کھویا ہے
بغیر اشک بہائے بغیر آہ کیے
کسی کی یاد کے سب موسموں کو جھیلا ہے



خود سے بچھڑ کے خود سے ملاقات کر کے دیکھ
اے بے خبر! یہ بے گھری راحت سے کم نہیں
اس کو سنبھال یہ بڑی انمول چیز ہے
بے لوث دوستی کسی نعمت سے کم نہیں



خود سے ملنا ابھی نہیں ممکن
کوئی میرے دھیان میں ہے ابھی
یوں تیقّن سے دستکیں دی ہیں
جیسے کوئی مکان میں ہے ابھی



خود کو دیکھا ہے خود سے باہر بھی
بوجھ پہچان کا نہیں اترا
کتنی مشکل ہے خود شناسی بھی
قرض اس جان کا نہیں اترا



خود کو سنبھال روشنی تصویر کر کے دیکھ
گر ہو سکے تو ساعتیں تحریر کر کے دیکھ
لفظوں کے پیرہن پہ سجا خواہشوں کے پھول
سوچوں کو اپنے لطف سے زنجیر کر کے دیکھ



خوش گمانی ہٹا نہیں پائی
راستے میں انا کا پتھر تھا
سائے جلتے ہوئے نظر آئے
بھیگی پلکوں پہ کوئی اخگر تھا



خوشبو سے عبارت ہے وہ رنگوں سے مزّین
رہتا ہے وہ ہر آن محبت کی فضا میں
ہے اس کے لب و لہجہ میں تاثیر غضب کی
رکھتا ہے وہ جادو سا اثر اپنی صدا میں



خوشبو سے کبھی ٹوٹا نہیں ربط ہمارا
ہم ہجر میں بھی صورتِ لوبان جلے ہیں
رکھا ہے بھرم ہم نے محبت کا کچھ اس طور
ہم قوسِ قزح اوڑھ کے راہوں پہ چلے ہیں



خوشبوئیں بھیک میں نہیں ملتیں
خوشبوؤں کو اگانا پڑتا ہے
رکھنے پڑتے ہیں خواب آنکھوں میں
کوئی منظر سجانا پڑتا ہے



خوشی آ کر گلے ملتی ہے مل کر مسکراتی ہے
تعجب ہے مگر میں پھر بھی سنجیدہ سا رہتا ہوں
میں سو پاتا ہوں نہ پوری طرح بیدار ہوں خالد
کسی وادی میں ہوں اور نیم خوابیدہ سا رہتا ہوں



خوشی کے گیت لکھنا چاہتا تھا
قلم کی آنکھ سے آنسو رواں ہیں
وہ جن کے دم سے ساری رونقیں تھیں
وہ چہرے خوبرو چہرے کہاں ہیں



درِ خستہ یہ دستک کس نے دی ہے
یہ کون آیا ہے تنہائی سے ملنے
اسے کہہ دو کہ واپس لوٹ جائے
خزاں رت میں نہیں یہ زخم سلنے



دراز تر ہیں بہت سلسلے محبت کے
دلوں کے بھید دلوں سے نہاں نہیں ہوتے
ہزار بار مسلط ہو جبر کا موسم
بہت سے لمحے مگر بے زباں نہیں ہوتے



درد کو سہنا سیکھ رہا ہوں
کچھ نہ کہنا سیکھ رہا ہوں
قطرہ قطرہ دریا بن کر
آنکھ سے بہنا سیکھ رہا ہوں



درد کی توقیر کچھ قائم رہے
چشمِ تر میں آنسوؤں کو روک لے
بے نوائی میں کوئی مفہوم رکھ
گفتگو کے سلسلوں کو روک لے



درد میں ڈوبی ہوئی ہے چاندنی تیرے بغیر
بے حقیقت ہو گئی ہے ہر خوشی تیرے بغیر
تھی کبھی دلہن کی صورت خواہشوں کی سیج پر
آج بیوہ کی طرح ہے زندگی تیرے بغیر



دریچے کھول کر بیٹھا ہے یخ بستہ ہواؤں میں
میں اس برفاب منظر میں اسے کیسے تمازت دوں
اسے گزرے دنوں کی نوحہ خوانی سے نہیں فرصت
میں اس کو آنے والے موسموں کی کیا بشارت دوں



دستِ ہنر سے ٹانک کسی شاخ پر گلاب
رقصِ خزاں نے چھین لی موسم کی آبرو
آنکھوں میں پھر سے خواب کے امکاں بحال کر
کر خامشی کو پھر سے عطا اذنِ گفتگو



دھوپ سے جلتے بدن پر ڈال دی اس نے ردا
غمگساری کے نئے احساس کو صورت ملی
آنکھ میں اتریں ادھورے خواب کی پرچھائیاں
دل کی بے تابی کو یوں اک بار پھر راحت ملی



دستک ہوئی سنی بھی گئی اس کے باوجود
دروازہ بند ہی رہا کھولا نہیں گیا
شاید اسی سبب سے ہیں بے تابیاں مری
پرکھا بہت گیا مجھے سمجھا نہیں گیا



دستکیں دیتی ہیں جب رات کو آ کر یادیں
میرے گھر سے مجھے کر دیتیں ہیں بے گھر یادیں
درد بڑھتا ہے تو پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
مضطرب کرتی ہیں اس طور یہ مضطر یادیں



دکھا رہا ہوں اسے موسم بہار کے رنگ
وہ جس نے پہن لیا ہے خزاں کا زرد لباس
یقیں کی آخری حد تک اسے بتایا ہے
جو ہو گا ٹھیک ہی ہوگا نہ بن قیافہ شناس



دل دھڑکتا تو ہو گا سینے میں
دل کی دھڑکن سے گفتگو کر لو
خواب پلکوں پہ آ کے بیٹھے ہیں
اپنی آنکھوں کو با وضو کر لو



دل کی آواز اٹھی، دبا دی گئی
زندگی کو یہ کیسی سزا دی گئی
ہم نے جذبات کو مضمحل کر دیا
سرد لہجے میں ہم کو صدا دی گئی



دل کی دنیا کے الگ معیار ہیں
صاحبانِ دل جدا سے لوگ ہیں
ہر کسی کا درد ان کا درد ہے
ان کے حصے میں انوکھے روگ ہیں



دل کے رستے سے آیئے صاحب
یہ سیاست نہیں محبت ہے
اس کے اطوار سب نرالے ہیں
اس کے دکھ درد میں بھی راحت ہے



دل نوازی کا انوکھا روپ ہے پیش نظر
روٹھ کر بھی وہ مجھے روٹھا ہوا لگتا نہیں
اس کی باتوں میں اتر آتی ہیں اکثر تلخیاں
اجنبی لہجہ مگر اس کا برا لگتا نہیں



دھرتی کا قرض ہم نے اتارا کچھ اس طرح
دھرتی کا پھول کلیوں سے چہرہ سجا دیا
مٹی کی پور پور میں خوشبو اتار دی
ذرے کو چھو کے اس کو ستارہ بنا دیا



دھند چھٹ جائے بے یقینی کی
برف لہجے اگر پگھل جائیں
منتظر آنکھ معتبر ٹھہرے
درد اشکوں میں کاش ڈھل جائیں



دھند ہے اور دھند میں سب راستے مسدود ہیں
دھند چھٹ جانے کے سب امکان بھی محدود ہیں
یاد کی پگڈنڈیوں پر بے حسی اگنے کے بعد
خامشی کا راج ہے اور رابطے مفقود ہیں



دھند ہے، بیتے دنوں کی یاد ہے، تنہائی ہے
اک تعلق کے عوض کیا کیا نہیں بخشا گیا
ایک اجلی سوچ کو بے آسرا کرنے کے بعد
آئینوں کے درمیاں اک آئینہ رکھا گیا



دھواں اک راکھ سے اٹھنے لگا ہے
سلگ اٹھا ہے پھر اقرار کوئی
بہت مانوس سی آہٹ ہوئی ہے
یقیناً ہے پسِ دیوار کوئی



دیکھ سکتا ہوں چھو بھی سکتا ہوں
بات ساری مرے دھیان کی ہے
پھول ہی پھول ہیں جہاں میں ہوں
ایک بستی مرے گمان کی، ہے



دیکھ سکتی ہیں دور تک آنکھیں
ان کو منزل دکھائی دیتی ہے
ہم کو اپنی خبر رہے نہ رہے
ایک آہٹ سنائی دیتی ہے



دیکھ غارت نہ کر محبت کو
یہ کلی ہر جگہ نہیں کھلتی
اس کے ملنے پہ شادیانے بجا
کم نصیبوں کو یہ نہیں ملتی



دیکھا پسِ غبار اسے آئینہ بدست!
آنکھوں نے بڑھ کے چوم لی آنکھوں کی روشنی
پھر آرزوِ وصل میں اترا نیا خمار
پھر لوٹ آئی صورتِ احساس زندگی



دیارِ عشق میں وہ شوخ اترا تو ہے اب دیکھیں
اسے کیسے جنوں آمیز ہجرت راس آتی ہے
یہاں پر رہنے والے بے گھری کا درد سہتے ہیں
فقط اہلِ نظر کو یہ مسافت راس آتی ہے



دیکھتا رہتا ہوں اترے دھوپ آنگن میں کبھی
بے سحر عمر رواں ہے خالی خالی ساعتیں
سارے اجلے موسموں کو ساتھ رکھتا ہوں مگر
وقت کج رفتار لے جاتا ہے ساری راحتیں



دیکھنے کو اب کوئی منظر نہیں
منظروں کے سب حوالے لے گیا
کیا کہوں کیا شخص تھا جاتے ہوئے
میری آنکھوں سے اجالے لے گیا



دیکھنے والی نظر موجود ہے
آئینے کو آئینہ تو کیجیے
بے سبب ہم سے گلہ اچھا نہیں
پہلے کوئی فیصلہ تو کیجیے



ڈر کا سارا نظام اندر ہے
اپنے اندر کو معتبر کر لے
اپنے خوابوں کے ساتھ زندہ رہ
اپنے خدشوں کو مختصر کر لے



ڈھونڈنے نکلے ہو خوشبو کو بیابانوں میں
اپنے اندر ہی کوئی پھول کھلایا ہوتا
آنکھ منظر سے اٹھا لاتی نئی رت کے گلاب
بھیگی پلکوں پہ کوئی خواب سجایا ہوتا



رابطہ بھی اُس نے رکھا لاتعلق بھی رہا
اک ہنرمند کا انوکھا یہ ہنر اچھا لگا
بے یقینی اور یقیں کے درمیاں ٹھہرا ہوا
دھند میں لپٹا ہوا اِک ہمسفر اچھا لگا



رات آنکھوں سے گری اور دن اداسی میں کٹا
منتظر بیٹھے رہے ہم وقت ہاتھوں سے گرا
کیا بتائیں کونسے منظر کا ہم حصہ رہے
کیا بتائیں کون ہے جو ہم سے ہے روٹھا ہوا



رات پہلو بدلتی رہی رات بھر
دھیرے دھیرے سلگتی رہی رات بھر
صبح کی روشنی کا چلن سوچ کر
لمحہ لمحہ بکھرتی رہی رات بھر



راحتیں نا پید ہو جانے کو ہیں
اپنے اپنے دل کی گرہیں کھول لیں
مختصر ہونے لگی ہے فصلِ گل
فاصلوں سے ہی سہی ہنس بول لیں



رازِ حیات منکشف ہونے کو تھا کہ ہم
اک منکرِ حیات کی باتوں میں آ گئے
بے پیرہن زمیں پہ گرے آسمان سے
اور حادثاتِ وقت کے ہاتھوں میں آ گئے



راگ سارے الاپ کر دیکھے
کوئی سر تال کارگر نہ ہوا
عمر پوری گزار دی لیکن
فاصلہ پھر بھی مختصر نہ ہوا



رتجگے، یادیں، ادھورے خواب کی پرچھائیاں
کم نہیں ہے یہ متاعِ بے بہا میرے لیے
کیسے ممکن ہے بھلا دوں میں اسے
آج تک جس کے لبوں پر ہے دعا میرے لیے



رتیں بدلتی رہی ہیں مگر نہ جانے کیوں
بچھڑنے والے سے ملنے کی رت نہیں آئی
بہت سے پھول کھلے ہیں بہار میں لیکن
ہمارے زخموں کے سلنے کی رت نہیں آئی



رخصتِ سفر کے ساتھ تھا عزمِ سفر مگر
اک طالبِ وفا سے وفا ہاتھ کر گئی
اشکوں کے سیلِ تند میں ہر خواب بہہ گیا
تعبیر بد گماں ہوئی بے موت مر گئی



رخصت ہوا تو کچھ بھی بتا کر نہیں گیا
اس بار جانے کیوں وہ ستا کر نہیں گیا
اس کو خبر بھی تھی کہ میں ناراض ہوں بہت
پھر بھی وہ بے لحاظ منا کر نہیں گیا



رکھ گیا ہے کوئی سلیقے سے
ایک اجلی سی داستاں مجھ میں
شام ہوتے مہکنے لگتا ہے
ایک خوشبو بھرا جہاں مجھ میں



رکھا کسی نے یاد یہ احساس ہی تو ہے
مانا گیا ہوں میں کسی تجویز کی طرح
اب اس سے بڑھ کے اور کیا تکریم ہو مری
اجلا سا اک حوالہ ہوں تعویز کی طرح



رکھا ہے ہر گھڑی تری یادوں سے منسلک
اک لطفِ خاص جس کی تجھے بھی خبر نہیں
احوال کیا بتائیں شب و روز کا تجھے
یہ دل کی داستان ہے اور مختصر نہیں



رکھیے مرے خیال کی چوکھٹ پہ اب قدم
اس حسنِ بے مثال کا صدقہ اتاریے
وہ نیند جس میں خواب کا کوئی گزر نہ ہو
آنکھوں سے ایسی نیند کا نشہ اتاریے



رگِ حیات میں حدت اتار دے اپنی
کہ جم رہا ہے لہو بے یقین موسم میں
دلوں کے بھید دلوں میں اترنے دے تاکہ
کمی نہ آئے کسی طور ربطِ باہم میں......



رنگ احساس کا بدلے تو بدل جاتے ہیں
آنکھ میں ٹھہرے مناظر بھی شناسائی بھی
زندگی ایک نئے روپ میں ڈھل جاتی ہے
صورتیں اپنی بدل لیتی ہے تنہائی بھی



رنگ چہرے کا شہابی ہو گیا
دیکھنے میں کیا عجب تاثیر تھی
بڑھتے پاؤں رک گئے تھے دفعتاً
جیسے پاؤں میں کوئی زنجیر تھی



رنگ، خوشبو سے مزّین ہے حیات
دل کی بستی سے گزر کر دیکھیے
آئینہ کر دے گا سب کچھ منکشف
آئینے میں بن سنور کر دیکھیے



رنگ، خوشبو سے وابستگی بخش کر
اک انوکھی خوشی دان کر دی گئی
میری سوچوں میں رکھی گئی اک مہک
زندگی مجھ پہ آسان کر دی گئی



زندگانی لے رہی ہے کروٹیں
تم کسی کروٹ سے کر لو رابطہ
پہن لو بدلی رتوں کا پیرہن
بھیڑ میں کوئی بنا لو راستہ



رنگ، خوشبو سے ہوئی وابستگی
زندگی یوں با سلیقہ ہو گئی
روبرو اک ناز پروردہ رہا
ناز برداری وظیفہ ہو گئی



رہتا ہے اپنی ذات میں محصور ہر گھڑی
لگتا ہے جیسے اس کو محبت نہیں ہوئی
ناواقفِ وصال ہے شاید اسی لیے
اس کو کبھی کسی سے شکایت نہیں ہوئی



رہگزر سے یوں ہوئے مانوس قدموں کے نشاں
جو مسافر کے لبوں پر تھی دعا سننا پڑی
دستکیں اتنے تسلسل سے ہوئیں کہ آخرش
اس مقفل در کو دستک کی صدا سننا پڑی



رو برو آیا وہ جب میرے تو میں نے یہ کہا
آپ کی آنکھوں میں میری ہو بہو تصویر ہے
ہے مرے حسنِ تصوّر کا یہ شاید معجزہ
خواب جو دیکھا تھا میں نے اس کی یہ تعبیر ہے



روشنی شمع تخئیل کی میسّر ہے مجھے
اک اجالا ہے جسے تقسیم کر سکتا ہوں میں
خواب کے اسرار سے محرم نہیں میرا ہنر
ہاں مگر کچھ ہے جسے تجسیم کر سکتا ہوں میں



خواب تعبیر سے مشروط نہیں ہو سکتے
خواب احساس سے شاداب ہوا کرتے ہیں
مشورہ دل سے کیا دل نے کہا خاموشی
درد سہنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں



رویوں پر ہی سب کچھ منحصر ہے
کبھی لہجہ بدل کر دیکھیے تو
محبت راکھ کر دے گی انا کو
ذرا خوشبو میں ڈھل کر دیکھیے تو



رویوں سے اگر رخصت ہوئی تو
محبت داستانوں میں رہے گی
تعلق سسکیاں بھرتا رہے گا
انا خالی مکانوں میں رہے گی



زبانِ شعر سے کب تک رہے گا وابستہ
وہ لطفِ خاص جو احساس کا ہے پروردہ
جبینِ حسن کو محرومِ لمس رہنا ہے
ادائے مہر و وفا ہو چکی ہے غم خوردہ



زندگی دشوار تر ہونے لگی
سرخوشی بھی بے اثر ہونے لگی
ذائقے کچھ اس طرح بدلے کہ اب
گفتگو بھی مختصر ہونے لگی



زندگی کا بھید کتنے منظروں میں قید ہے
جاننے والے کبھی یہ راز کہہ پائیں گے کیا
ہیں عجب کچھ مرحلہ ء شوق کی دشواریاں
کوئی سمجھا ہی نہیں تو ہم سمجھ پائیں گے کیا



زندگی کی حقیقتوں سے پرے
ہے تخیّل کا اک جہان الگ
نیم خوابیدہ منظروں سے سجا
اس جہاں کا ہے آسمان الگ



روک پایا ہے کبھی کوئی نہ رک سکتا ہے
یاد کا سیلِ رواں آنکھ سے بہہ جاتا ہے
دیکھتے دیکھتے کھل جاتے ہیں اسرار تمام
یہ الگ بات کہ کچھ دل میں بھی رہ جاتا ہے



زندگی نے لباس بدلا ہے
آرزو شعلہ بار دیکھی ہے
ایک پیکر سجا ہوا سا ہے
موسموں نے بہار دیکھی ہے



زندگی دشوار تر ہونے لگی
سر خوشی بھی بے اثر ہونے لگی
ذائقے کچھ اس طرح بدلے کہ اب
گفتگو بھی مختصر ہونے لگی



زندگی ہم سے کچھ گریزاں ہے
کاش اس تک رسائی مل جائے
آنکھ میں خواب زندہ ہو جائیں
رتجگوں سے رہائی مل جائے



جس جگہ روکا مجھے اُس نے میں فوراً رُک گیا
اب وہ کہتا ہے میں اس کے ساتھ کیوں چلتا نہیں
میں تو تسلیم و رضا کی آخری منزل پہ تھا
مجھ سے اب اس کا کسی صورت گلہ بنتا نہیں



رنگ پھیکے سے نظر آتے ہیں جانے کس لیے
جانے کیوں آنکھوں میں اب قوسِ قزح جچتی نہیں
چھوڑ دی جاتی ہے آخر کیوں ادھوری داستاں
کشتئ امید کیوں ساحل پہ آ لگتی نہیں

یادداشت



1۔ زرد موسم کا عذاب (1991) غزلیں، قطعات، نظمیں

2۔ ابھی آنکھیں سلامت ہیں (2009) نظمیں

3۔ ہوا کو بات کرنے دیں (2012) غزلیں، نظمیں

4۔ خواب سفر کا رستہ (2015) نظمیں

5۔ اسے تصویر کرنا ہے (2017) نظمیں، غزلیں

6۔ قوسِ خیال (2020) قطعات

7۔ رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے (2021) نظمیں، غزلیں

8۔ سمے کا دھارا (2022) نثری نظمیں

9۔ خوابوں کے حاشیے پر (2023) قطعات

10۔ تہی دامن نہیں ہیں ہم (2024) قطعات

11۔ تم محبت خرید لائے ہو (2024) (انتخاب اشعار و نظمیں یونس خیال) مرتبہ یوسف خالد

یوسف خالد کے فکر و فن پر لکھی گئی کتب

1۔ نقطے (نامور شعرا اور ادبا کی آراء) (مرتبہ -- ڈاکٹر یونس خیال) (1990)

2۔ یوسف خالد کی تخلیقی جہات (معروف ناقدین کے مضامین) (مرتبہ -- ڈاکٹر عابد خورشید) (2016)

3۔ میں حرفوں سے عبارت ہوں (یوسف خالد کی منتخب نظمیں) (مرتبہ -- دلاور علی آزر) (2021)

4۔ نقد و نظر یوسف خالد کی نثری نظمیں (نامور ناقدین کی نظر میں) (مرتبہ -- ذوالفقار احسن) (2024)